بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مثالی مملکت

(IDEAL STATE)

تمام ناکامیوں میں سب سے بڑی ناکامی خود انسان کی ہے۔ اُس انسان کی جو سب سے زیادہ مدنی الطبع حیوان اور سب سے زیادہ عقلمند ہے۔ اور وہ ناکامی یہ ہے کہ یہ اپنے لئے آجتک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکا جسے، دور سے بھی، اچھی حکومت کہا جا سکے۔ اس نے اس باب میں بڑی بڑی کوششیں کی ہیں۔ بہت سی ایسی جو فی الواقعہ محیر العقول ہیں، اور بہت سی ایسی جو بڑی جرأت آزما تھیں۔ لیکن جب ان کی عملی تنفیذ کا وقت آیا تو نتیجہ حسرت و یاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ نظری طور پر حکومت کا خاکہ کھینچ لینا اور بات ہے اور عملی طور پر اسے نافذ کرنا اور بات۔ نظری طور پر حکومت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے اور ارباب حکومت پبلک کے خادم ہیں۔ لیکن جب حکومت ہاتھ آجاتی ہے تو اس پبلک کی خدمت نہیں بلکہ سلب و نہب ہو جاتا ہے۔

یہ الفاظ عہد قدیم کے کسی سیاستدان یا مفکر کے نہیں، جو اس نتیجے پر اُس زمانے میں پہنچا ہو جب انسان نے ہنوز محض دو ایک اسالیبِ حکومت کا تجربہ کیا تھا اور اُسے اُن نظامہائے مملکت کا علم نہیں تھا جنہیں انسانوں نے بعد میں وضع اور اختیار کیا۔ اگر اس کے سامنے، بعد کے وضع کردہ نظام ہوتے تو وہ اس نتیجہ پر نہ پہنچتا۔ یہ الفاظ خود ہمارے زمانے کے ایک ماہر سیاست (H. J. MENCKEN) کے ہیں۔ جنہیں اس نے اپنی کتاب (TREATISE ON RIGHT & WRONG) میں عہد قدیم سے لے کر عصرِ حاضر تک کے تمام نظامہائے حکومت کا جائزہ لینے کے بعد لکھا ہے۔ اس میں مغرب کا وہ جمہوری نظام بھی شامل ہے۔

جو اس وقت تک کی فکرِ انسانی کی آخری ایجاد ہے، اور جس پر یورپ کو بڑا ناز ہے (یا بڑا ناز تھا) اس سب سے آخری نظام کے متعلق پروفیسر مینکن لکھتا ہے:

ان مختلف اسالیبِ حکومت میں، سب سے زیادہ ناکام، نظام جمہوریت رہا ہے۔ جمہوری نظام کے ارباب حل وعقد خوب جانتے ہیں کہ حکومت کی بنیاد معقولیت پر ہونی چاہیئے لیکن ان کا جذبۂ محرکہ کبھی معقولیت پسند نہیں ہوتا۔ ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ جو عنصر بھی باہر سے زیادہ دباؤ ڈال سکے، اس کا ساتھ دیا جائے۔ چنانچہ اس ہتھکنڈے سے، یہ لوگ، ان عناصر کے توسط سے جو فی الحقیقت پبلک کے دشمن ہوتے ہیں، لامتناہی عرصہ تک برسرِ اقتدار رہتے ہیں۔

مغرب کے جمہوری نظام کی ناکامی کی اصل وجہ کیا ہے، اس کے متعلق ہم بعد میں دیکھیں گے۔ سردست، صرف اتنا دیکھئے کہ مؤرخین اور مفکرین کی رائے یہ ہے کہ انسان نے اپنی تمدنی زندگی کے پانچ چھ ہزار سال کے عرصہ میں جس قدر اسالیبِ حکومت وضع کئے ہیں۔ ان میں ایک بھی کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ سب ناکام رہے ہیں۔ میں نے "مؤرخین اور مفکرین" اس لئے کہا ہے کہ انسان نے سابقہ نظامہائے حکومت کے ناکام تجارب کے بعد، جس جمہوری نظام کو اختیار کیا تھا۔ اس کے ہاتھوں یورپ کے قریب قریب تمام ارباب فکر و نظر تنگ آچکے ہیں، اور اس کی بجائے کسی بہتر نظام کی تلاش میں مضطرب و بے قرار پھر رہے ہیں (تفصیل ان امور کی میری کتاب "انسان نے کیا سوچا" میں ملے گی)

سوال یہ ہے کہ انسان نے اتنے طول طویل عرصہ میں، اس قدر مختلف اور متنوع تجربے کئے۔ تو اس کی کیا وجہ تھی کہ ان میں کوئی تجربہ بھی کامیاب ثابت نہ ہوا۔ سب ناکام رہ گئے۔

ناکامی کی وجہ کیا ہے؟

انسان کی اس مایوس کن ناکامی کے اسباب و وجوہات کی تفصیل میں جائیں تو نہ معلوم داستان کس قدر طویل ہو جائے، لیکن اسے اگر چند لفظوں میں سمیٹنا چاہیں تو اس ناکامی کی بنیادی وجہ یہ سامنے آئے گی کہ انسان نے جو نظامِ حکومت بھی وضع کیا، اس میں حکومت کا اختیار و اقتدار، انسانوں کے ہاتھ میں تھا۔ مختلف زمانوں میں حکومت کی شکلیں بدلتی رہیں، لیکن روح، ہر پیکر میں یہی کارفرما رہی۔ وہ قدیم ترین زمانہ کا قبائلی نظام تھا۔ یا بعد کا شہنشاہی نظام۔ وہ مذہبی پیشوائیت کے سہاروں پر قائم شدہ، خداوندی اختیارات (DIVINE RIGHTS) کا حامل نظام تھا، یا خدا کو حدودِ مملکت سے باہر نکال کر سیکولر انداز کا نظام۔ وہ عصرِ حاضر کا ڈکٹیٹرشپ کا نظام تھا یا انسانی ذہن کی آخری تصنیف، جمہوری نظام۔ ان سب میں ایک ہی حقیقت کارفرما رہی اور کارفرما ہے۔ اور وہ یہ کہ ان میں حکومت کا اقتدار، انسانوں کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ایک انسان ہو یا انسانوں کی جماعت۔ اس نے قوتِ بازو سے سلطنت حاصل کی ہو یا وہ لوگوں کا منتخب کردہ ہو۔ اس کا نتیجہ آلڈوس ہکسلے کے الفاظ میں یہ کہ:

تاریخ میں کوئی زمانہ بھی ایسا نہیں گزرا جو یہ بتائے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں قوت و اقتدار آیا ہو ان میں سرکشی نہ پیدا ہو گئی ہو۔ اور ایسا باور کرنے کے لئے کوئی وجہ موجود نہیں کہ جو کچھ پیچھے سے ہوتا چلا آرہا ہے وہ آج نہیں ہو گا یا آئندہ بھی ایسا ہی نہیں ہوتا رہے گا۔

(SCIENCE, LIBERTY AND PEACE)

"تشکیل انسانیت" کا مصنف، برفو، اس سلسلہ میں لکھتا ہے۔

نشۂ اقتدار کی بدمستیاں

یہ بیماری لازمی اور لا علاج ہے۔ ارادے کتنے ہی نیک کیوں نہ ہوں، جب اقتدار ہاتھ میں آجائے تو اس کے مہلک اثرات سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ نشۂ اقتدار وہ بلا ہے جس سے انسانی قلب کی ہر حرکت الٹی ہو جاتی ہے۔ ہر شے ٹیڑھی نظر آتی ہے۔ ہر نقطہ نگاہ باطل ہو جاتا ہے۔ ہر فیصلہ میں ذاتی رجحانات کی رنگ آمیزی ہو جاتی ہے۔ ہر معاملہ میں تعصب دخیل ہو جاتا ہے۔ تمام ذہنی سکے، فریب کے ٹکسال میں ڈھلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ پُر فریب اقتدار دل و دماغ پر مستولی ہو جاتا ہے۔

اسی حقیقت کو ہمارا حکیم مشرق ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں　　سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک
تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے !　　صاحب نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے　　عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

"اسکندر و چنگیز" کی طرف اشارہ کرنے سے یہ مقصود نہیں کہ انسانیت کی یہ تباہیاں، صرف شخصی حکمرانوں کے ہاتھوں میں آئی ہیں۔ جمہوری حکومت میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام　　جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب　　تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

سوال شخصی اور جمہوری حکومت کا نہیں۔

ایک انسان کا دوسرے انسان پر اقتدار و اختیار، خواہ وہ کسی رنگ میں ہو استبداد ہے۔ طاقتور ہمیشہ کمزور کے حقوق کو غصب کرتا ہے۔ قوت، عدل و انصاف کو پامال کر دیتی ہے۔ اس لئے ظالم و جابر ہوتی ہے...... یہ انکشاف آج کا نہیں، بہت قدیم ہے کہ اقتدار مطلق، بنیادی طور پر باطل ہے خواہ یہ کسی کے ہاتھ میں بھی کیوں نہ ہو۔ لارڈ ایکٹن نے ٹھیک کہا تھا کہ قوت، انسان کو خراب کر دیتی ہے اور مطلق قوت، اسے بالکلیہ خراب کر دیتی ہے...... نشۂ اقتدار سے انسان میں معقولیت کے ساتھ سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ قوت کسی رنگ میں ہو، اس کے یہی نتائج ہوں گے۔ وہ جاہ و منصب کی ہو یا پنجۂ فولاد کی۔ دولت کی ہو یا محض ذہنی برتری کی۔ دفاتری زندگی میں کسی افسر کی ہو یا حاکم کی۔ کسی پادری کی ہو یا پروہت کی۔ قوت بہرحال قوت ہے اور فساد کی جڑ۔ اس کا لازمی نتیجہ ظلم اور بیدادگری ہوتا ہے...... اور ان سب میں، سب سے زیادہ خراب قوت وہ ہے جو اکثریت محض اپنی تعداد کے زور پر، اقلیت کے خلاف استعمال کرتی ہے۔ (برفو۔ تشکیل انسانیت)

کمیونزم

یورپ کے سرمایہ دارانہ جمہوری نظام کے خلاف کمیونزم نے آواز بلند کی تھی اور دنیا کے مزدوروں کو پکار کر کہا تھا کہ اس لعنت کے خلاف متحدہ طور پر محاذ قائم کرو۔ اس میں سوائے تمہاری زنجیریں ٹوٹ جانے کے اور کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ جور و استبداد کے ستائے ہوئے انسانوں نے، اس آواز کو نوید مسیحا

سمجھا اور اس آئین نو کو گلے سے لگایا۔ لیکن تجربے نے جلدی بتا دیا کہ کمزوروں کو آزادی اس سے بھی نصیب نہیں ہو سکتی۔

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

لارڈ ایکٹن اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ

حکومتیں انسانوں پر مشتمل ہوتی ہیں اور ہر انسان میں وہ کمزوریاں پائی جاتی ہیں جو نوعِ انسان کا خاصہ ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ قوانین وضع کرتے ہیں اور ملک کی پالیسی کی تشکیل کرتے ہیں۔ وہ دوسرے لوگوں سے کسی طرح بھی زیادہ شریف یا زیادہ ہوشمند نہیں ہو سکتے۔

(THE NEW WORLD)

اس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ انسان فطرۃً ایسا واقع ہوا ہے کہ وہ کوئی قابلِ اطمینان نظامِ حکومت قائم نہیں کر سکتا۔ لیکن برفراسے انسان کی بدفطرتی پر محمول نہیں کرتا۔ وہ اپنے اسی نظریہ کو دہراتا ہے کہ:

قوت بہرحال قوت ہے اور فساد کی جڑ۔ اس کا لازمی نتیجہ ظلم اور بیدادگری ہوتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ ہر شخص فطرۃً بد واقع ہوا ہے بلکہ اس لئے کہ قوت کا نشہ ہی ایسا ہوتا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ انسان اپنے پانچ چھ ہزار سال کے ناکام تجارب کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ جب تک اقتدار انسانوں کے ہاتھ میں رہے گا (خواہ وہ ایک انسان ہو یا انسانوں کی جماعت) دنیا میں اطمینان بخش نظامِ تمدن و مملکت قائم نہیں ہو سکے گا۔ ایسے نظام کے قیام کے لئے اولیں اور بنیادی شرط یہ ہے کہ حکومت کا اختیار اور اقتدار کسی انسان کے ہاتھ میں نہ رہے۔

سوال یہ ہے کہ جس نتیجے پر انسان، اتنے طویل المیعاد تجربات، اور اس قدر جانکاہ مشقتوں اور جگر پاش مصیبتوں کے بعد پہنچا ہے۔ جس نتیجہ تک پہنچنے کے لئے اسے اس قدر خون کے دریا بہانے اور آگ کی خندقیں پیرانی پڑیں۔ جس کے لئے انسانیت صدیوں تک تڑپتی، پھڑکتی، کٹتی، جلتی اور ذبح ہوتی رہی۔ کیا یہ آواز اس سے پہلے بھی کہیں سے سنائی دی تھی، اور اگر سنائی دی تھی تو اس نے کیا نتیجہ پیدا کیا تھا؟ ہاں! یہ آواز، آج سے قریب ڈیڑھ ہزار برس پہلے، عرب کی سرزمین میں جہاں اس سے پہلے علم و بصیرت کی کرن تک کا گزر نہیں ہوا تھا۔

زبانِ وحی کا اعلان

ایک صحرانشین کی زبان سے بلند ہوئی تھی جس نے وحیِ خداوندی کے الفاظ میں، ساری دنیا کو للکار کر کہا تھا کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰) حکومت کا حق خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

وہ اپنے اس حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (۱۸/۲۶)۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس حق میں کسی کو شریک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ معلوم کائنات کی ساری مخلوق میں، انسان کا مقام

سب سے اونچا ہوں۔ جب انسان اس حق خداوندی میں شریک نہیں تو اس کے بعد، اس میں اور کون شریک ہو سکتا ہے۔

برگسان نے کہا تھا کہ

مملکت کا اقتدار اعلیٰ، انسانوں پر نہیں بلکہ اشیاء پر ہونا چاہیئے۔ تاکہ ایک انسان کا دوسرے انسان پر کوئی اقتدار نہ ہو۔

(THE TWO SOURCES OF MORALITY & RELIGION)

جہاں تک اشیائے کائنات پر اقتدار کا تعلق ہے، از بانِ وحی نے انسانوں سے کہہ دیا کہ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (۴۵/۱۳) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، خدا نے سب کو اپنے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ تاکہ انسان، ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے۔ آدم کے سامنے ملائکہ کے سجدہ ریز ہونے سے مفہوم ہی یہ ہے کہ انسان، کائنات کی ہر قوت کو مسخر کر سکتا ہے۔ اس لئے اشیائے کائنات پر انسان کا کلی اقتدار ہے۔ لیکن جہاں تک خود انسانوں کا تعلق ہے خدائے کائنات نے واضح الفاظ میں کہدیا کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔۔۔۔۔ (۳/۷۸) ۔ کسی انسان کے شایانِ شان نہیں کہ خدا اُسے ضابطۂ قوانین ۔ ان قوانین کو نافذ کرنے کا اختیار، اور نبوت تک بھی دیدے تو وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم خدا کی محکومی کو چھوڑ کر میری محکومی اختیار کر لو"۔

لیکن انسانوں پر نہیں

اسے پھر سن لیجئے کہ خدا نے یہ کہا ہے کہ دنیاوی حکومت کی مسندوں پر براجمان ہو جانے والے تو ایک طرف رہے کسی نبی کو بھی اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ انسانوں پر اپنی حکومت چلائے۔ وہ یہی کہے گا کہ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ (۱۹/۳۰) میں خود خدا کا محکوم ہوں۔ اس لئے مجھے حقِ حکومت کس طرح حاصل ہو سکتا ہے ؟

برادرانِ عزیز ! غور کیجئے۔ اس سے بڑا انقلابی اعلان، کائنات کی فضاؤں میں کہیں اور بھی سنا گیا ہے ؟ وہ اعلان جس نے اس تصور کو یکسر باطل قرار دے دیا کہ کسی انسان کو دوسرے انسان پر کسی قسم کا اقتدار و اختیار حاصل ہے۔ اس اعلانِ عظیم نے، انسانوں کے خود ساختہ ایوانہائے حکومت و سطوت کی بنیادوں تک کو ہلا دیا اور غلامی اور محکومی کی ان تمام زنجیروں کو توڑ کر رکھ دیا۔ جن میں انسانیت صدیوں سے جکڑے چلی آ رہی تھی۔ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷) خواہ یہ زنجیریں، دنیاوی حکمرانوں کے تغلب و تسلط نے انسانوں کی گردن میں ڈال رکھی ہوں، اور خواہ مذہبی پیشوائیت نے تقدس و عقیدت کے ہاتھوں، انہیں لوگوں کے دل و دماغ کے گرد لپیٹ رکھا ہو۔ اس زلزلہ انگیز اعلانِ حریت نے ان تمام زنجیروں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور انسان کو دنیا میں گردن اٹھا کر چلنے کے قابل بنا دیا۔

خدا کی حکومت سے مفہوم

یہاں سوال یہ سامنے آتا ہے کہ خدا کی حکومت سے مفہوم کیا ہے ؟ خدا نہ کسی کے سامنے آتا ہے۔ نہ اس کا تختِ حکومت کہیں بچھا ہوا نظر آتا ہے

نہ اُسے کسی نے کوئی حکم دیتے دیکھا ہے، نہ اُس کی آواز سُنی ہے۔ پھر اُس کی حکومت کے معنی کیا ہیں؟ کیا اس سے مراد انسانوں کا، خدا کے نام پر حکومت کرنا ہے؟ کیا اس سے مطلب یہ ہے کہ بعض انسانوں کو خدائی اختیارات حاصل ہوتے ہیں اگر یہی مطلب ہے تو، تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں کہ اس سے بڑھ کر انسانی استبداد اور سخت گیری کی مثال کسی اور اندازِ حکومت میں نہیں ملے گی؟ انسان نے جس قدر، خدا کا نام لے کر، دوسرے انسانوں کو ستایا ہے، شیطان کے حصّے میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں آیا ہوگا۔ اور تماشہ یہ کہ نمرود و فرعون، اور ہلاکو اور چنگیز نے اگر انسانوں پر مظالم روا رکھے تو دنیا آج تک ان کا نام لعنت اور پھٹکار سے لیتی ہے، لیکن جن "مقدسین" کے طائفہ نے ان سے کہیں زیادہ انسانیت کے خونِ ناحق سے اپنے ہاتھ رنگے، ان کے مجسمے پرستش گاہوں میں نصب کئے گئے۔ لہٰذا خدا کی حکومت سے یہ مفہوم تو ہو نہیں سکتا۔ وہ قرآن جو کسی نبی تک کو انسانوں پر حکومت کرنے کا حق نہیں دیتا۔ عام انسانوں کو اختیاراتِ خداوندی استعمال کرنے کا حق کیسے دے گا؟

آپ دیکھیے کہ انسانی اقتدار و اختیار سے مراد کیا ہے؟ انسان دوسرے انسانوں پر کس طرح حکومت کرتا ہے؟

انسانی اقتدار سے مراد

آپ عہدِ قدیم کے بے آئینی کے دور کو چھوڑیئے جب ایک انسان محض قوت کے زور پر، دوسرے انسانوں پر حکومت کرتا تھا۔ ہمارے زمانے میں یہ حکومت "قانون" کے ذریعے ہوتی ہے جس انسان، یا انسانوں کی جماعت کو، قانون سازی کا حق ہوتا ہے، زمامِ اقتدار اسی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ جماعت جو کچھ کرنا چاہتی ہے پہلے اس کے لئے ایک قانون وضع کر لیتی ہے۔ اس کے بعد اُس کا ہر قدم، قانون کے مطابق (LEGAL) ہو جاتا ہے اور ہر حرکت، آئینی (CONSTITUTIONAL) قرار پاجاتی ہے۔ اس کا نام انسانوں کی ڈکشنری میں "مہذب طرزِ حکومت" یا عادلانہ اندازِ مملکت ہے۔ لیکن، اگر الفاظ کے ان حسین و جمیل پردوں کو ہٹا کر، اصل حقیقت کو دیکھیں تو، آلڈوس ہکسلے کے الفاظ میں۔

> اس باب میں دورِ جاہلیت اور عہدِ حاضر میں بس یہ فرق نظر آئے گا کہ ہم کھلے ہوئے تشدد کی دنیا سے فریب کاری کی دنیا کی طرف بڑھے چلے آرہے ہیں۔
>
> (ENDS AND MEANS)

قانون سازی کا حق

قرآن، قانون سازی کا حق کسی انسان، یا انسانوں کی جماعت کو نہیں دیتا۔ وہ قانون کے سرچشمہ اور ماخذ کو اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔ وَعِنْدَهٗ اُمُّ الْكِتٰبِ (۴۳/۴)۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی زندگی کے لئے جس قدر قوانین و ضوابط کی ضرورت تھی، ان کے اصول و حدود، خدا نے متعین کر دیئے۔ جن میں تغیّر و تبدل کا کسی کو حق حاصل نہیں۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ (۶/۱۱۵) اب انسانوں کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ ان اصولی قوانین کی روشنی میں پیش آمدہ معاملات کا فیصلہ کرتے جائیں۔ خدا نے یہ قوانین، قرآن کریم کے اندر منضبط و محفوظ کر دیئے اور اس کے بعد، اور تو اور، خود نبی اکرمؐ سے کہہ دیا کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸) ان کے معاملات کے فیصلے انہی قوانین کی روشنی میں کرتے جاؤ اور دوسری طرف یہ اعلان کر دیا کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝

جو لوگ اس کے مطابق فیصلے نہیں کریں گے جو خدا نے نازل کیا ہے انہیں کافر کہا جائے گا۔ (۵/۴۴)

ان اصولی قوانین کو مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہا جاتا ہے۔ مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کے حالات کے مطابق، ان اقدار کو نافذ کرنے کے لئے عملی تدابیر سوچے اور ذرائع و وسائل بہم پہنچائے اُس کا حق قانون سازی صرف اس حد تک محدود ہوگا۔ یہی وہ بنیادی اصولِ مملکت ہے جس کے متعلق پروفیسر جوڈ نے کہا تھا کہ:

اچھی زندگی سے مفہوم یہ ہے کہ انسان مستقل اقدار کو حاصل کر سکے۔ بنابریں میں کہہ سکتا ہوں کہ مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے جن میں ایک انسان کے لئے مستقل اقدار کا حصول ممکن ہو جائے۔ سوسائٹی کی ترقی کا یہی ایک پیمانہ ہے۔

(GUIDE TO THE PHILOSOPHY OF MORALS AND POLITICS)

مادّی اقدار۔ قرآن جب مملکت کو مستقل اقدار کے تحفظ کا ذریعہ بتاتا ہے تو اس سے یہ مطلب نہیں کہ وہ محض اخلاقی اقدار (ETHICAL VALUES) کا تحفظ چاہتا ہے، اور مادّی اقدار (MATERIAL VALUES) سے اُسے کچھ سروکار نہیں۔ وہ نظامِ مملکت کو مادّی اقدار کے تحفظ کا بھی ضامن قرار دیتا ہے، اس لئے کہ انسان کی موجودہ سطحِ زندگی پر، اخلاقی اقدار، مادّی ذرائع ہی سے بروئے کار آتی ہیں۔ اسی لئے قرآن (SOUND MIND IN A SOUND BODY) ــــ توانا جسم میں توانا قلب ــــ کے اصول کا قائل ہے۔ وہ کہتا ہے تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا بہم پہنچانا نظامِ مملکت کی ذمہ داری ہے۔ اس کے لئے مملکت، خدا کی طرف سے یہ ذمہ داری اپنے اوپر لیتی ہے اور افرادِ معاشرہ کو اس کی ضمانت دیتی ہے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (۶/۱۵۱) تمہیں اور تمہاری اولاد کو سامانِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ جب تک مملکت اس فریضۂ خداوندی کو ادا کرتی رہتی ہے، وہ خدا کی حفاظت میں رہتی ہے۔ جب وہ اس سے غافل ہو جاتی ہے، خدا کی ذمہ داری بھی ختم ہو جاتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے نبی اکرمؐ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ

اگر کسی بستی میں کوئی ایک شخص بھی اس حالت میں صبح کرے کہ وہ رات بھر بھوکا رہا ہو تو اس بستی کے رہنے والوں سے خدا کی حفاظت کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔

اور اسی عظیم ذمہ داری کا احساس تھا جس کی بنا پر حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ "اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو خدا کی قسم عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی"۔ "بنیادی ضروریاتِ زندگی" میں روٹی۔ کپڑا۔ مکان۔ علاج سب کچھ آجاتا ہے۔ اس کے علاوہ، مملکت کا فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کی ذہنی اور قلبی صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچائے۔ اس لئے کہ قرآن نے اسلامی مملکت کے فرائض میں یہ بھی کہا ہے کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ (اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ) اٰتَوُا الزَّكٰوةَ (۲۲/۴۱)۔ وہ سامان نشوونما بہم پہنچاتی ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ (۲۳/۴)۔ وہ لوگوں کی صلاحیتوں کی نشوونما کی تدابیر کرتے ہیں۔ پروفیسر بیکن نے کہا تھا کہ نظری طور پر مملکت، افراد مملکت کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے۔ لیکن قرآن نے اس سے بہت پہلے کہہ

دیا تھا کہ نظری طور پر ہی نہیں بلکہ عملی طور پر، مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرے، اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کے سامان و ذرائع بہم پہنچائے۔

تمام انسانوں کی پرورش

یہ مملکت، اس سامانِ پرورش اور اسبابِ نشوونما کو صرف اپنے شہریوں تک محدود نہیں رکھے گی۔ یہ اس کی ابتدا اپنے ہاں سے کرے گی لیکن اس کے بعد اس دائرے کو وسیع سے وسیع تر کرتی چلی جائے گی۔ اس لئے کہ یہ اس خدا کے احکام و قوانین کو جاری و ساری کرنے کے لئے وجود میں آتی ہے جو رب العلمین اور رب الناس ہے۔ یعنی تمام نوعِ انسان کا پرورش کرنے والا۔ اس لئے یہ مملکت، اس باب میں، انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کرے گی۔ اس ضمن میں قوم، ملک، رنگ، نسل، زبان حتیٰ کہ مذہب تک کا اختلاف بھی، کوئی تفریق پیدا نہیں کرے گا۔ اس کے لئے بس "انسان" ہونا کافی ہوگا۔ وہ کسی ملک کا رہنے والا ہو، کسی قوم کا فرد ہو، کسی نسل سے متعلق ہو، کوئی زبان بولتا ہو۔ اور اس کا مذہب بھی کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ مملکت ان سب سے یکساں سلوک کرے گی۔ صرف "یکساں سلوک" ہی نہیں، بلکہ ان سب کی یکساں عزت کرے گی، اس لئے کہ وہ مستقل اقدار جن کے تحفظ کے لئے اس مملکت کی تشکیل ہوتی ہے۔

تکریمِ آدمیت

ان میں بنیادی حیثیت اس 'قدر' کو حاصل ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) خدا نے تمام انسانوں کو، محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں طور پر واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ ہر انسانی بچہ۔ پیدائش کے اعتبار سے یکساں عزت کا مستحق ہے۔ اس عزت و تکریم کے لئے اس آدمی کا آزاد ہونا کافی ہے۔ آدمیت احترامِ آدمی :۔

اس مملکت کا منشور ہوگا۔

نیشنلزم

ہمارے زمانے میں، انسانی تباہی کا سب سے بڑا سبب، نیشنلزم کا مغربی تصور ہے جس نے انسانوں کی برادری کے اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں کہ ایک انسان، دوسرے انسان کے خون کا پیاسا ہو گیا ہے۔ انسان کی، اس سے بڑی حماقت کیا ہوگی کہ وہ نقشے پر ایک لکیر کھینچ لیتا ہے اور پھر اس لکیر کے دوسری طرف بسنے والے، اپنے ہی جیسے انسانوں سے شدید نفرت اور سخت عداوت، دل میں پیدا کر لیتا ہے۔ ہمارے دور کی تاریخ بتاتی ہے کہ :

> مختلف اقوام میں باہمی لڑائیوں کا سبب اس کے سوا شاید ہی کچھ اور ہو کہ انسانوں کی مختلف جماعتوں نے اپنے اپنے الگ نام رکھ لئے تھے۔
>
> (FREDRICK HERTZ — NATIONALITY IN HISTORY AND POLITICS)

یہی وہ نیشنلزم ہے جو برٹرینڈ رسل کے الفاظ میں :۔

> نوعِ انسان کی تباہی کے لئے سب سے بڑی قوت ہے۔ پھر تماشہ یہ ہے کہ ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز ہے اور اپنے وطن کی نیشنلزم بہت اچھی ہے۔
>
> (THE HOPE FOR A CHANGING WORLD)

اقبالؒ نے آج سے پچاس سال پہلے کہا تھا کہ تہذیب کے آذر نے جس قدر صنم تراشے ہیں،

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اقبالؒ نے یہ بات، وحی کی عطا کردہ بصیرت کی روشنی میں کہی تھی۔ یورپ کے مفکر، پچاس سال کے تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ

> نیشنلزم ایک بت پرستانہ اور مشرکانہ مذہب کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ایسا مذہب جو فساد اور تفرقِ انسانیت کے لئے ایسا طاقتور ہے کہ کوئی توحید پرست مذہب، فلاح و وحدتِ انسانیت کے لئے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نیشنلزم بالکل پاگلوں کا مسلک ہے۔
>
> (A. HUXLEY — THE PERENNIAL PHILOSOPHY)

اسی لئے تو۔

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے — تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے — کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

مغرب کے تصورِ قومیت کے مقابلہ میں یہ "قومیتِ اسلام" کیا ہے جس کی طرف اقبالؒ نے اشارہ کیا ہے وہ اسے سمجھ لینے سے قرآن کی پیش کردہ مثالی مملکت کا واضح تصور سامنے آجاتا ہے۔ قرآن کا اعلان ہے کہ کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (2/213)

انسانوں کی عالمگیر برادری

تمام نوعِ انسان ایک عالمگیر برادری ہے۔ اس لئے وہی نظامِ تمدن صحیح اور کامیاب ہو سکتا ہے جو پوری انسانیت کو ایک قوم تصور کر کے قائم کیا جائے۔ جب تک انسان، رنگ، نسل، زبان اور جغرافیائی حدود کی بنیادوں پر مختلف قوموں میں بٹا رہے گا، دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکے گا۔ یورپ نے نیشنلزم کی تباہیوں کا علاج، انٹرنیشنلزم میں سوچا لیکن اتنے مختصر سے عرصہ کے تجربہ نے ہی یہ حقیقت اس پر واشگاف کر دی کہ اس مصیبت کا یہ حل بھی نہیں۔ اس لئے کہ

> جو مسئلہ دنیا کے سامنے پیش ہے وہ ایسا مسئلہ نہیں جو قوموں کے حل کرنے کا ہو۔ وہ تو خود قوموں کا پیدا کردہ ہے۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم کے نظریہ نے انسانی معاشرہ میں ایک فساد برپا کر دیا ہے۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ خود نیشنلزم، خواہ وہ انٹرنیشنلزم ہی کیوں نہ بن جائے، اس کا حل دریافت کر سکے۔ اس مسئلہ کا حل عالمگیر انسانیت ہے۔ یعنی ایک ایسا عقیدہ یا تحریک جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ قومیت اور بین الاقوامیت کی سطح سے بلند ہو کر خالص انسانی سطح پر امن قائم کرنا چاہتی ہے۔
>
> (EMERY REVES — THE ANATOMY OF PEACE)

انسان کے تمدنی مسائل کا یہ وہ حل ہے جسے زبانِ وحی نے آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے پیش کیا تھا۔ انسانی ذہن نے اسے اُس وقت نہ اپنایا، لیکن اب صدیوں تک آگ اور خون کی ہولی کھیلنے کے بعد بالآخر وہ اس حل کی طرف آ رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ جو مثالی مملکت ان خطوط کے مطابق متشکل کی جائے گی اس کی ابتدا کسی ایک خطۂ زمین سے ہو گی۔ یہ

مثالی مملکت کی تجربہ گاہ

خطۂ زمین اس عظیم اور عالمگیر انقلابی نظریہ کی تجربہ گاہ بنے گا۔ اس خطۂ زمین کی حفاظت نہایت ضروری ہوگی۔ اس لئے کہ اگر لیبارٹری ہی محفوظ نہیں رہے گی تو تجربہ کہاں ہوگا؟ اس مثالی مملکت میں وطن کی یہ حیثیت ہوتی ہے، اور اس اعتبار سے، اس کو مستحکم اور محفوظ رکھنا افراد وطن کا اوّلین فریضہ ہوتا ہے۔ وطن وہ صدف ہے جس میں جوہرِ انسانیت، گہر آبدار بنتا ہے۔ اس لئے گہر کی پرورش اور نشوونما کے لئے صدف کی حفاظت اور استحکام ضروری ہے۔ وطن ہی نہیں، بلکہ ساری طبیعی زندگی اور مادی اسباب و وسائل وہ مرکب (VEHICLE) ہیں جن پر سوار ہو کر جوہرِ انسانیت اپنی منزل تک پہنچتا ہے، جو مسافر اپنی سواری کی پرواہ اور حفاظت نہیں کرتا، اس سے زیادہ احمق کون ہے۔ لیکن سواری، بہرحال ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے۔ مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ وہ (MEANS) ہوتی ہے (END) نہیں ہوتی۔

اب مجھے اُس سوال کی طرف آنا چاہئے جو اس مقام پر آپ کے دل میں بار بار اُبھر رہا ہے۔ یعنی اس سوال کی طرف کہ جہاں تک ان اصولوں کا تعلق ہے، وہ تو فی الواقعہ مثالی (IDEAL) ہیں، لیکن مملکت کا کاروبار بالآخر

مملکت انسانوں کے ہاتھوں سے عمل میں آئے گی

انسانوں کے ہاتھوں سے سرانجام پائے گا۔ اس کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ انسان ان اصولوں کو اچھی طرح چلائیں گے اور انہیں (ABUSE) نہیں کریں گے جہاں تک محض اصولوں کا تعلق ہے، دنیا کی کوئی مملکت بھی ایسی نہیں جس کے آئین و ضوابط میں کوئی نہ کوئی اچھا اصول نہ ہو۔ ان سب کے ہاں اچھے اچھے اصول، آئینی ضابطوں میں درج ہیں لیکن انسانی ہاتھوں سے ان اصولوں کی جو درگت بنتی ہے، وہ سب کے سامنے ہے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن اس مشکل کا کیا حل تجویز کرتا ہے؟ سوال بڑا اہم اور بنیادی ہے، اسلئے اس کا جواب بھی، اسی نسبت سے غور طلب اور محتاجِ توجہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ دنیا کی مختلف مملکتوں میں، باوجودیکہ ان کے آئین و ضوابط میں بلند پایہ اصول مندرج ہیں، اس قدر فساد کیوں برپا ہے۔ مختلف اقوام میں، باوجودیکہ ان میں بین الاقوامی معاہدات، اور عالمی اداروں کی بلند آہنگ قراردادیں موجود ہیں، باہمی بے اعتمادی اور تخریب کوشی کیوں ہے؟ پھر کسی ایک ملک یا قوم میں نہایت عمدہ ضوابط قوانین و ہدایات کے باوجود ارباب اقتدار ان کی پاسداری، اور عام افراد مملکت، قانون کا احترام کیوں نہیں کرتے؟ (SPALDING) ان تمام سوالات کا ایک ہی جواب دیتا ہے۔ وہ اپنی کتاب :- (CIVILISATION IN EAST & WEST) میں لکھتا ہے۔

مادی تصورِ حیات

موجودہ یورپ، دنیا کو "مادی انجیل" کا سبق دیتا ہے جس سے زندگی کے متعلق وہ تصور پیدا ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ انسانی امن کے بجائے درندوں کی جنگ ہے۔ یہ عالمگیر شورش اور عدم اطمینان اسی تصور کا نتیجہ ہے۔ تہذیب مغرب کے لئے (اور اس کے ساتھ دوسری تمام تہاذیب کے لئے جو اس کی نقل کرتی ہیں) خطرہ کا موجب حکومت کی کوئی خاص شکل نہیں۔ اصل خطرہ کی بات یہ ہے کہ ان کی ہر حکومت خالص مادی بنیادوں پر قائم ہے جب تک یہ بنیاد نہیں بدلتی، شکلوں کے بدل دینے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

سوال یہ ہے کہ یہ "مادی تصورِ حیات" کیا ہے جو عالمگیر فساد کی جڑ، قومی تباہ کاریوں کا موجب اور انفرادی خرابیوں کا باعث ہے۔ اس تصورِ حیات کی تفصیل تو لمبی ہے، لیکن اس کا ماحصل یہ ہے کہ انسانی زندگی عبارت ہے اس کے جسم سے۔ جو

طبیعی قوانین کے مطابق زندہ رہتا ہے اور انہی کے مطابق ایک دن ختم ہو جاتا ہے۔ اور اس کے خاتمے سے اس فرد کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ نہ انسان کی زندگی اس کے ماوراء کچھ اور ہے، اور نہ ہی اس کے اوپر کوئی اور قوت ہے۔

اس تصورِ حیات کا جو اثر زندگی کے اور شعبوں پر پڑتا ہے، سردست اسے چھوڑیئے۔ اس وقت صرف یہ دیکھئے کہ جہاں تک انسان کی تمدنی اور سیاسی زندگی کا تعلق ہے، اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ ذیل کی مثالیں اس حقیقت کو واضح کر دیں گی۔

قانون سازی کے اختیارات

(۱) خواہ شیفت جیسا آمر مطلق ہو یا اس کی حکومت جیسا جمہوری ادارہ، دونوں میں قانون سازی کے اختیارات لامحدود ہوں گے۔ سیکولر گورنمنٹ کی بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے۔ وہ، نہ کسی غیر متبدل اصول کی پابند ہو، نہ کسی ناقابل تغیر اخلاقی شرائط سے مشروط۔ وہ جس قسم کا جی چاہے قانون بنائے اور جب جی چاہے اس میں ترمیم کر دے یا اسے منسوخ ہی کر دے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں، ہر مملکت ایسے قوانین مرتب کرے گی جو اس مملکت کے لئے فائدہ مند ہوں۔ اسے باقی دنیا میں بسنے والے انسانوں کے مفاد سے کوئی تعلق نہیں ہوگا (ROMELIN) نے ٹھیک کہا تھا کہ

> مملکت کا بنیادی فریضہ اپنے مفاد کا تحفظ اور اپنی قوت کی نشو و نما ہے۔ اسے کسی دوسری مملکت کا خیال صرف اس صورت میں رکھنا چاہئے جبکہ اس سے اس کے اپنے مفاد کے خلاف زد نہ پڑتی ہو۔

ان حالات میں جو بین الاقوامی فساد برپا ہو سکتا ہے، وہ ظاہر ہے۔

(۲) حکومت میں جو پارٹی برسر اقتدار آئے گی، وہ ایسے قوانین بنائے گی جن سے اس جماعت کے مفادات کا تحفظ ہو سکے جس کی وہ نمائندگی کرتی ہے۔ خواہ دوسری پارٹیوں کے مفاد پر اس کی زد کیسی ہی کیوں نہ پڑے۔ جب اس کی جگہ دوسری پارٹی برسر حکومت آئے گی تو وہ پہلی پارٹی کے وضع کردہ قوانین کو منسوخ کر دے گی اور ایسے جدید قوانین مرتب کرے گی، جن سے ان کی پارٹی کے مفاد کا تحفظ ہو۔ اس سے خود ملک کے اندر مختلف جماعتوں اور طبقات میں جس قدر فساد برپا ہوگا اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

قانون کی پابندی

(۳) اس تصورِ حیات کے تحت، ملک کے قانون کی پابندی صرف وہ شخص کرے گا جسے اس کا احساس ہو کہ قانون کی خلاف ورزی سے:

(ا) وہ سوسائٹی میں بدنام ہو جائے گا۔
(ب) پولیس کی گرفت میں آجائے گا۔ اور
(ج) عدالت اسے سزا دے دے گی۔

اگر کوئی شخص ایسا انتظام کر لے کہ وہ خلاف ورزی قانون سے پولیس کی گرفت میں نہ آسکے، اور اگر وہ پکڑا بھی جائے تو عدالت سے چھوٹ جائے۔ نیز معاشرہ میں وہ ایسا بااثر ہو کہ کوئی شخص اس کے خلاف لب کشائی نہ کر سکے۔ یا معاشرہ میں جرائم اس قدر عام ہو جائیں کہ جرم کا ارتکاب باعث ذلت ہی نہ سمجھا جائے، تو اس کے بعد کوئی جذبہ محرکہ ایسا نہیں رہے گا جس کے تحت، قانون کی پابندی یا اس کا احترام باقی رہ سکے۔ چنانچہ آج کل تمام مہذب ممالک میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ ہر جگہ جرائم بڑھتے جاتے ہیں، اور جرائم کے انسداد کا علاج، ارباب نظم و نسق کی سمجھ میں اس کے سوا کچھ نہیں آتا کہ پولیس کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے۔ چنانچہ جرائم کی کثرت اور پولیس کے اضافہ کی رفتار میں مسلسل دوڑ (RACE) جاری

رہتی ہے۔ یہ تو کسی مملکت میں بھی ممکن نہیں کہ ہر شخص کے سر پر ایک سپاہی مسلط رہے۔ اس لئے جرائم کی روک تھام ناممکن ہو چکی ہے۔ ان حالات میں آپ سوچئے کہ کیا دنیا میں کوئی مملکت بھی ایسی ہو سکتی ہے جس کا نظم و نسق صحیح خطوط پر قائم رہ سکے، اور کوئی پارٹی بھی ایسی ہو سکتی ہے کہ اقتدار اس کے ہاتھ میں آنے اور وہ اپنے فائدے کی نہ سوچے؟

یہ ہیں اُس مادی تصورِ حیات کے فطری نتائج جس پر تہذیبِ مغرب کی اساس و بنیاد ہے۔ اس کے برعکس، قرآن کی رُو سے تصورِ حیات یہ ہے کہ

قرآنی تصورِ حیات

(الف) انسان صرف طبیعی جسم سے عبارت نہیں۔ جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے۔ جسے انسانی ذات کہتے ہیں۔ انسانی ذات کی نشوونما، مقصدِ حیات ہے۔

(ب) جس طرح خارجی کائنات کے لئے خدا کے متعین کردہ قوانین از خود موجود ہیں۔ وہ انسانوں کے وضع کردہ نہیں نہ ہی انسان ان میں تغیر و تبدل کر سکتا ہے۔ اسی طرح انسان کی تمدنی زندگی کے لئے بھی ابدی اصول متعین ہیں جن میں کوئی انسان یا انسانوں کی جماعت کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں کر سکتی۔

(ج) خدا کے مقرر کردہ قوانین کی خلاف ورزی کی سزا کا انحصار اس پر نہیں کہ اگر جرم کرنے والے کو کوئی شخص دیکھ لے یا اُسے گرفتار کرے، تو اُسے اس کی سزا ملے اور اگر ایسا نہ ہو، تو وہ سزا سے بچ جائے۔ خدا کا قانون یہ ہے کہ آگ میں اُنگلی ڈالئے سے اُنگلی جل جائے گی اور اس میں سخت تکلیف ہوگی۔ اس میں صورت یہ نہیں ـــــ

قانونِ مکافات

کہ اگر کوئی شخص آپ کو آگ میں اُنگلی ڈالتے ہوئے دیکھ لے تو آپ کی اُنگلی جلے اور اس میں تکلیف ہو۔ اور اگر اسے کوئی دیکھنے نہ پائے تو آپ اس "جرم" کی سزا سے بچ جائیں۔ یہ سزا آپ کو بہر حال مل کر رہے گی، خواہ آپ اس کا ارتکاب پہاڑ کی چوٹی پر، یا زمین کے غار کے اندر، تنہائی میں بھی کیوں نہ کریں۔ اسے خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔

جس طرح طبیعی قوانین کی خلاف ورزی کا اثر انسان کے جسم پر ہوتا ہے، اسی طرح، اخلاقی قوانین کی خلاف ورزی کا اثر انسان کی ذات پر پڑتا ہے یعنی جس طرح سنکھیا کھانے سے انسان کی جسمانی زندگی ختم ہو جاتی ہے، اسی طرح حرام کا مال کھانے سے اس کی ذات تباہ ہو جاتی ہے۔ جس طرح آگ کے غلط استعمال سے ہاتھ جل جاتا ہے، اسی طرح اختیارات کے غلط استعمال سے انسانی ذات کی صلاحیتیں جھلس جاتی ہیں۔ اسے جہنم کا عذاب کہا جاتا ہے۔ جس طرح سنکھیا اپنا ہلاکت آفریں اثر کر کے رہتا ہے خواہ آپ اسے بند کمرے کے اندر، ایسے وقت میں کھائیں جب کہ آپ کو دیکھنے والا کوئی نہ ہو، اسی طرح مالِ حرام اپنا تباہ کن اثر کر کے رہتا ہے خواہ اس کا کسی کو علم ہو سکے یا نہ۔

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَ مَنْ جَهَرَ بِهٖ وَ مَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۢ بِالَّيْلِ وَ سَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ۝ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ۝ (۱۳ / ۱۱-۹)

اس کے لئے برابر ہے خواہ تم میں سے کوئی بات کو چھپائے یا اسے بلند آواز سے کہے۔ خواہ وہ رات کی تاریکیوں میں چھپ کر رہے یا دن کی روشنی میں چلے۔ اس کے آگے اور پیچھے ایسے پاسبان لگے ہوئے ہیں جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتے اور اس کی ہر نقل و حرکت اور قول و عمل کو ریکارڈ کرتے رہتے ہیں۔ وہ ریکارڈ کبھی ضائع نہیں ہو سکتا۔ یہ ریکارڈ ہر

انسان کی گردن میں لٹکا رہتا ہے۔

وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ (۱۷/۱۳)

نگاہ کی خیانت

جہاں تک طبیعی قوانین کا تعلق ہے، ان کا نقصان صرف اس وقت پہنچتا ہے جب ان کی خلاف ورزی عمل میں آجائے۔ آپ ہزار مرتبہ دل میں خیال کریں کہ جب آپ کے سامنے آگ آئے گی تو آپ اس میں کود جائیں گے۔ اس سے آپ کے جسم پر ذرا بھی آنچ نہیں آئے گی۔ آپ کا جسم اس وقت جلے گا جب آپ عملاً آگ میں کود جائیں گے۔ لیکن جہاں تک اخلاقی اقدار کا تعلق ہے، ان کی خلاف ورزی کا نقصان ارادہ کرنے سے بھی پہنچ جاتا ہے۔ آپ کسی کے ہاں بیٹھے ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ وہ ذرا اندر جائے اور آپ اس کا قلم اڑا لیں۔ آپ دیر تک اسی خیال میں بیٹھے رہتے ہیں لیکن (آپ کی بدقسمتی کہ) وہ اٹھ کر اندر نہیں جاتا۔ آپ بالآخر تھک کر ناکام چلے آتے ہیں۔ آپ نے چوری نہیں کی۔ دنیا کا کوئی قانون آپ سے مؤاخذہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اخلاقی اقدار کے قانون کی رو سے، آپ کی ذات کو اس ارادہ سے بھی سزا مل جائے گی۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ (۴۰/۱۹) وہ نگاہ کی خیانتوں اور دل کے ارادوں تک سے واقف ہوتا ہے۔

دنیاوی جرائم کی عدالت میں اگر مجرم کے خلاف شہادت یا ثبوت نہ ملے، تو وہ چھوٹ جاتا ہے لیکن اخلاقی اقدار

اپنے خلاف آپ شہادت

کی عدالت میں، نہ کسی خارجی ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے نہ باہر کے گواہ کی۔ وہاں ہر مجرم، اپنے خلاف خود گواہی دیتا اور ثبوت پیش کرتا ہے۔ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا (۱۷/۱۴) آج تو تیری اپنی ذات تیرا حساب لینے کے لئے کافی ہے۔ پھر جس طرح آگ میں ہاتھ ڈالنے کے بعد، گورنر جنرل کی سفارش بھی آپ کو اس کے درد سے محفوظ نہیں رکھ سکتی اور لاکھ روپے کی رشوت بھی آپ کو اس تکلیف سے بچا نہیں سکتی۔ نہ ہی کوئی دوسرا آپ کی جگہ وہ دکھ بھگت سکتا ہے۔ اسی طرح مستقل اقدار کی خلاف ورزی کی سزا سے کسی صورت چھٹکارا نہیں ہو سکتا۔

يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ۝ (۲/۴۸)

اس میں نہ کوئی شخص کسی دوسرے کے کسی کام آسکے گا۔ نہ کسی کی سفارش قبول کی جائے گی۔ نہ کچھ معاوضہ لے کر اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ نہ ہی اس کا کوئی حامی و ناصر ہوگا۔

ان لوگوں کے ہاتھ میں نظم و نسق

قرآنی مملکت کا نظم و نسق ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا جن کا خدا کے اس قانونِ مکافات پر پورا پورا یقین ہو، اس پر ان کا ایمان ہو جنہیں یقینِ محکم ہو کہ اقدارِ انسانیت کی خلاف ورزی سے ان کی ذات کا نقصان ہوگا اور یہ نقصان دنیاوی فوائد کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ جس طرح عام مملکت کا نظم و نسق ان لوگوں کے ہاتھ میں نہیں دیا جاتا جنہیں اپنے نفع نقصان کا بھی ہوش نہ ہو۔ اسی طرح اس مثالی مملکت کا انتظام بھی ان لوگوں کو نہیں سونپا جاتا جنہیں اپنی ذات کے نفع نقصان کا خیال نہ ہو۔ ایسے لوگ اس کے اہل ہی تصور نہیں کئے جاتے۔ وہ اس کے لئے (DISQUALIFY) ہو جاتے ہیں۔

ایمان کسے کہتے ہیں

کہہ دیا جائے گا کہ کہنے کو تو اس قسم کا اقرار ہر شخص کر لیتا ہے لیکن ان باتوں کو عمل میں کوئی نہیں لاتا۔ اس لئے بات پھر وہیں آجاتی ہے کہ اس کی کیا گارنٹی ہے کہ یہ لوگ اپنے ایمان کے مطابق عمل بھی کریں گے۔ اس کے لئے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ایمان کہتے کسے ہیں؟ آپ آگ میں ہاتھ کیوں نہیں ڈالتے؟ اس لئے کہ آپ کو یقین ہے کہ آگ میں ہاتھ ڈالنے سے آپ کا ہاتھ جل جائے گا۔ اسی کو ایمان کہتے ہیں۔ یہ ایمان طبیعی قوانین کے متعلق ہے۔ مستقل اقدار کے متعلق بھی جس کا ایمان اس قسم کا ہو، اسے ایمان والا کہا جائے گا۔ اس قسم کے ایمان کے بعد ممکن نہیں کہ انسان زبان سے کچھ کہے اور عمل اس کے خلاف کرے۔ جو شخص جانتا ہے کہ سنکھیا مہلک ہوتا ہے اس کی یہ کیفیت کبھی نہیں ہو سکتی کہ وہ زبان سے تو سنکھیا کو مہلک کہے لیکن جب سنکھیا سامنے آئے تو اسے جھٹ سے نگل لے۔ وہ کبھی ایسا نہیں کرے گا۔ بڑی سے بڑی رشوت بھی اسے اس پر آمادہ نہیں کر سکے گی۔ مال و دولت کا عظیم نقصان بھی اسے اس کے لئے تیار نہیں کر سکے گا۔ وہ سب کچھ برداشت کرے گا لیکن سنکھیا نہیں کھائے گا۔ اسے کہتے ہیں سنکھیا کی ہلاکت آفرینی پر ایمان۔ اس سے کم درجے کا اقرار، ایمان کہلاتا ہی نہیں۔ لہٰذا، کسی مومن کے لئے ممکن ہی نہیں کہ وہ کسی ایسے کام کے لئے آمادہ ہو جائے جس سے اس کی ذات کی ہلاکت ہوتی ہو۔

ایسے لوگ ہوں گے اس مثالی مملکت کے اربابِ حل و عقد۔

دین کی بنیادوں پر مملکت

یہ بنیادیں جن پر اس مثالی مملکت کی عمارت استوار ہوتی ہے، قرآن کی اصطلاح میں، دین کے اجزا کہلاتے ہیں۔ جب مملکت دین کے تابع رہے تو نوعِ انسان کے لئے ابرِ رحمت ہوتی ہے۔ اور جب دین سے الگ ہو جائے تو تباہیوں کا موجب۔ طرزِ حکومت کے بدلنے سے اس میں کچھ فرق نہیں آتا۔

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یہ مثالی مملکت قائم ہوتی ہے مستقل اقدار کی بنیادوں پر، اور اس کی بقا کا راز اس غیر متبدل ابدی اصول میں ہوتا ہے کہ

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۝ (13/17)

بقاء اسی شے کے لئے ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو

انسانیت کے لئے نفع بخش

کسی خاص جماعت، خاص پارٹی، خاص گروہ، خاص ملک، خاص قوم کے لئے نفع بخش نہیں بلکہ پوری کی پوری انسانیت کے لئے نفع بخش۔ حتیٰ کہ اس میں مسلم اور غیر مسلم کی بھی کوئی تمیز نہیں۔ ہر شخص اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے اس مملکت کی نفع رسانیوں سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔ اس میں غیر مسلموں کی جان، مال، عزت، آبرو ہی کی حفاظت نہیں بلکہ ان کی پرستش گاہوں تک کی حفاظت بھی مملکت کا فریضہ ہوتی ہے۔ اور ہر ایک کے معاملات عدل و انصاف کی رو سے طے پاتے ہیں۔ حتیٰ کہ دشمن کے ساتھ بھی عدل کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس حکم کی تعمیل اس کا فریضہ ہوتا ہے کہ

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ